درختوں کی دُنیا

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ نئی دہلی

نہرو بال پستکالیہ —— 28

درختوں کی دُنیا

مصنف :- رسکن بونڈ

مصوّر :- سدھارتھ بنرجی

مترجم :- مظہرالحق علوی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ نئی دہلی

1976 (ساکا 1898)

قیمت 1/50

THE WORLD OF TREES (Urdu)

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

دہلی[6]، نئی دہلی[25]، بمبئی[3]، علی گڑھ[1]

ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A-5 گرین پارک، نئی دلی 16 نے

تھامسن پریس (انڈیا) لمیٹڈ، فریدآباد (ہریانہ) میں چھپواکر شایع کیا۔

عظیم الشان برگد

بلند قامت لوگ عموماً نیک اور رحم دل ہوتے ہیں۔ یہی حال بڑے درختوں کا ہے کہ وہ بڑے ہی دوستانہ قسم کے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے درختوں میں برگد غالباً سب سے بڑا اور سب سے زیادہ دوستانہ قسم کا درخت ہوتا ہے۔

اب تو شہروں میں برگد بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کو بڑھنے اور پھیلنے کے لیے بہت زیادہ جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کے بھرے پُرے اور حد سے زیادہ آباد شہروں میں آدمیوں کو رہنے کے لیے جگہ یا تو ملتی ہی نہیں یا اگر ملتی ہے تو ناکافی تو پھر بچارے برگد کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع کہاں مل سکتا ہے؟ چنانچہ اس بے حد دوستانہ قسم کے درخت نے شہروں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ تم جانو ایک برگد کو اتنی ہی جگہ چاہیے جتنی جگہ میں ایک عالی شان تین منزلہ عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ تاہم شہر کے اکثر پارکوں میں برگد اپنی پوری شان اور آن کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور ہر گاؤں دیہات میں بھی کم سے کم ایک برگد تو ہوتا ہی ہے۔

عام درختوں کی جڑیں نیچے ہی نیچے زمین میں پھیلتی ہیں اس کے برخلاف برگد کی جڑیں اس کی ٹہنیوں سے لٹک کر نیچے زمین تک پہنچتی اور پھر جڑ پکڑتی ہیں۔ ہمارے یہاں انھیں "جٹائیں" کہتے ہیں۔ یہ جٹائیں جب زمین پکڑ لیتی ہیں تو پھر ان میں سے بھی مزید ٹہنیاں اور ان ٹہنیوں میں سے مزید جٹائیں پھوٹتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ چند برسوں میں ایک اکیلا برگد ہی آپ اپنا "بن" یا جنگل بنا لیتا ہے۔ چنانچہ اگر برگد کو جٹا دھاری بھگوان شِو کے بالوں کا روپ سمجھا جاتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں!

بڑے، موٹے اور مضبوط ستون جس طرح محل کو سنبھالے ہوتے ہیں اسی طرح یہ جٹائیں برگد کو سہارا دیے رہتی ہیں۔ اگر ستون گرا دیے جائیں تو سارا محل اڑڑ دھم کر کے نیچے آ رہے گا اسی طرح ان جٹاؤں کو کاٹ دیا جائے تو غریب برگد بھی زمین پر آ رہے گا کیوں کہ اس کے مرکزی تنے کی جڑیں تو بہت گہرائی تک اُتری ہوئی ہوتی نہیں۔ چنانچہ اس کے اُگنے کے لیے چھوٹے باغ، باغیچے اور ہر دم چلتی ہوئی سڑکوں کے کنارے نہ تو مناسب ہیں اور نہ ہی کافی۔ اور یہ دیکھو بھئی برگد کو کہیں اپنے گھر کے قریب لگانے کی غلطی نہ کر بیٹھنا ورنہ ایک دن تم یہ دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گے کہ یہ حضرت برگد تو تمھاری خواب گاہ کی دیوار میں ہی جگہ بنا رہے ہیں۔

برگد کی چھاؤں بڑی ہی ٹھنڈی اور خنک ہوتی ہے اور تم آسانی سے اس پر چڑھ سکتے ہو اور پھر گرنے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ برگد کی بلند ترین ٹہنی پر پہنچ جانے کے بعد اگر تم وہاں بیٹھنا چاہو تو یقین کرو تم بڑے آرام سے بیٹھ سکو گے۔ تم اس کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر مزے سے کوئی کتاب پڑھ سکتے ہو اور پھر کوئی تمھارے اس شغل میں مخل بھی نہ ہوگا کیوں کہ برگد کے چوڑے اور چمک دار پتّوں نے تمھیں یوں چھپا رکھا ہوگا کہ تم کسی کو نظر ہی نہ آسکو گے۔

اب یہ بھی سُن لو کہ برگد بڑا ہی مہماں نواز اور مُسافر نواز درخت ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو تو وہ اپنے قریب آنے کی دعوت دیتا ہی ہے لیکن ان کے علاوہ قسم قسم کے مہمانوں کو بھی پناہ دیتا ہے۔ قسم قسم کے پرندے، گلہریاں، کیڑے مکوڑے، چمگادڑ اور اسی قسم کے اور بہت سے جاندار اسی پر بسیرا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ برگد میں بہت سے ٹھنڈے اور اندھیرے گوشے ہوتے ہیں جہاں یہ مختلف قسم اور مزاج کے کرایے دار، سکون، اطمینان اور بے فکری سے رہتے ہیں۔ چنانچہ یوں سمجھو کہ برگد کو ایک بہت بڑے ہوٹل یا بورڈنگ ہاؤس کی طرح ہے جس کے کمروں میں بھانت بھانت کے خاندان مقیم ہیں اور وہ سب اپنے پڑوسیوں کے معاملات میں قطعی دخل اندازی نہیں کرتے۔

جب برگد کی نازک نازک اور گلابی گلابی کونپلیں پھوٹتی ہیں تو اس میں ہی ایک نازک اور خوب صورت تتلی اس کی مہمان بنتی ہے اور پھر ان کی حفاظت میں اپنے انڈے چھوڑ جاتی ہے۔ اس کے پتّوں پر ایک قسم کا چکنا اور میٹھا مادّہ یا لیس ہوتا ہے، جن سے گلہریاں خوب لطف اندوز ہوتی ہیں۔

موسم سرما کی راتوں میں ایک اور پرندہ اس درخت پر بسیرا کرنے آتا ہے جسے مہاراشٹر کے لوگ "پاوسلا" کہتے ہیں جس کا مطلب "بارش آنے والی ہے" ہوتا ہے۔ لیکن ایک انگریز کا، جو اس پرندے کی چیخ وپکار کی وجہ سے رات بھر سو نہ سکا تھا، کہنا ہے کہ اگر تم اس پرندے کو بولتے غور سے سنو تو وہ یہ کہتا معلوم ہوتا ہے کہ "ہائے۔ ہائے۔ کتنی گرمی ہے۔ ہم اسے محسوس کر رہے ہیں۔ ہم اسے محسوس کر رہے ہیں۔ ہم اسے محسوس کر رہے ہیں!" اور اسی انگریز نے اس پرندے کا نام "برین فیور برڈ" رکھا تھا۔ (یعنی ایسا پرندہ جسے دماغی بخار ہو گیا ہو۔)

برسات کے موسم میں برگد پر بہار آجاتی ہے۔ اس کی ٹہنیاں انجیر کے سے چھوٹے چھوٹے اور سرخ سرخ پھلوں سے لد جاتی ہیں۔ تمھیں تو یہ پھل (جن میں کیڑے بجبجاتے ہیں) یقیناً پسند نہ آئیں گے لیکن برگد کی ٹہنیوں پر جھولا جھولتی ہوئی بلبلیں آپس میں جھگڑتی ہوئی مینائیں اور شور مچاتے ہوئے کوّے بڑے شوق سے یہ پھل کھاتے ہیں اور جب اندھیرا اترتا ہے اور یہ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک جاتے ہیں تو پھر چمگادڑوں کے جھنڈ آتے ہیں جو ٹہنیوں سے لٹک کر خوب مزے سے ان پھلوں کی ضیافت اڑاتی ہیں۔

برگد کا پیڑ انجیر کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور ہندوستان میں اس قبیلے کے ہر درخت کو — جن میں زیادہ مشہور پیپل ہے — مقدس سمجھا جاتا ہے۔ الٰہ آباد میں مقدس سنگم پر ایک برگد کھڑا ہوا ہے، بے حد قدیم اور عظیم الشان۔ جسے "اکشیاوت" یعنی لافانی کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں اور اب بھی لاکھوں یاتری اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے ایک چینی سیّاح "ہیون سانگ" ہندوستان آیا تھا اُس نے بھی اس برگد کا ذکر کیا ہے۔

تین مقدس درختوں کے جھنڈ کو "تنتر" یعنی تثلیث کہتے ہیں۔

برگد، پیپل اور پاکر کے پیڑوں کو ایک ساتھ اور ایک ہی مقام پر لگایا جائے تو اس تثلیث کو سب سے زیادہ مقدس سمجھا جاتا ہے اور اسے "ہرسنکری" یعنی ہری کا سنگھاسن کہا جاتا ہے۔

برگد کو ہندی میں "بڑ" اور تامل میں "آلا" کہتے ہیں۔ لیکن انگریزی میں اس کا نام ہے "بنین" (Banyan)۔ اب سوال یہ ہے کہ انگریزی میں اس کا یہ عجیب نام کیوں ہے؟ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں ہندوستان پہنچنے والے یورپینوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے بنیے، جو بڑے زبردست تاجر ہوتے ہیں، اس درخت کو خصوصیت سے پسند کرتے ہیں اور اسی کی چھاؤں میں ان کی پوجا پاٹھ بھی ہوتی ہے، مشورے اور لین دین بھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے یورپ کے باشندوں نے اس درخت کا نام ہی "بنیہ" رکھ دیا جو آگے چل کر "بنین" بن گیا۔
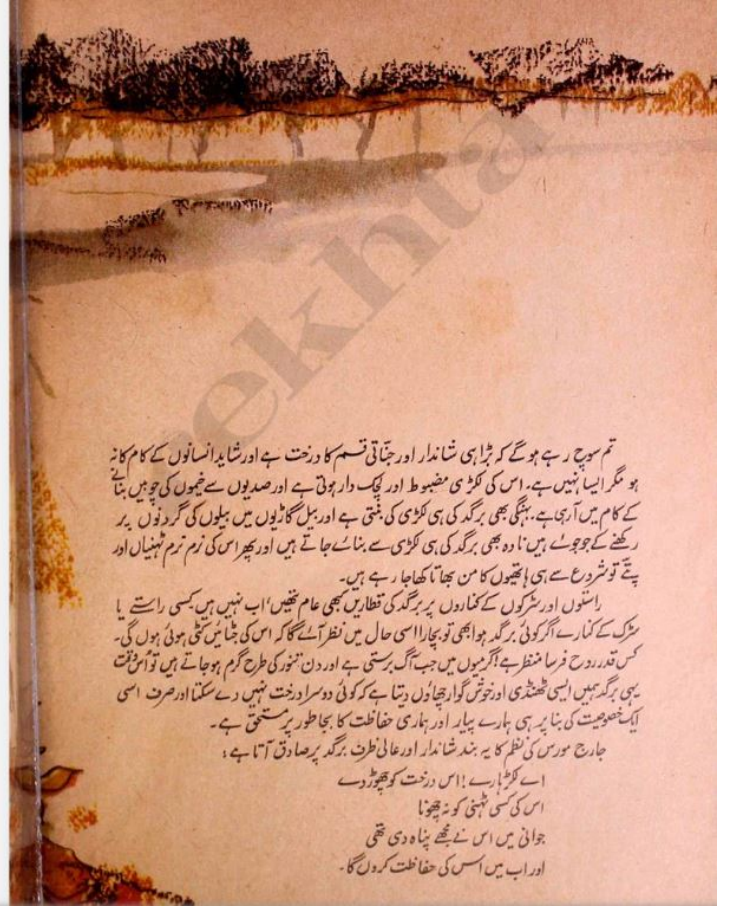
تم سوچ رہے ہوگے کہ بڑا ہی شاندار اور جناتی قسم کا درخت ہے اور شاید انسانوں کے کام کا نہ ہو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی لکڑی مضبوط اور لچک دار ہوتی ہے اور صدیوں سے خیموں کی چوبیں بنانے کے کام میں آرہی ہے۔ بہنگی بھی برگد کی ہی لکڑی کی بنتی ہے اور بیل گاڑیوں میں بیلوں کی گردنوں پر رکھنے کے جو جوئے ہیں نا وہ بھی برگد کی ہی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اور پھر اس کی نرم نرم ٹہنیاں اور پتے تو شروع سے ہی ہاتھیوں کا من بھاتا کھاجا رہے ہیں۔

راستوں اور سڑکوں کے کناروں پر برگد کی قطاریں کبھی عام تھیں، اب نہیں ہیں۔ کسی راستے یا سڑک کے کنارے اگر کوئی برگد ہوا بھی تو بچارا اسی حال میں نظر آئے گا کہ اس کی جٹائیں کٹی ہوئی ہوں گی۔ کس قدر روح فرسا منظر ہے! گرمیوں میں جب آگ برستی ہے اور دن تنور کی طرح گرم ہو جاتے ہیں تو اس وقت یہی برگد ہمیں ایسی ٹھنڈی اور خوش گوار چھاؤں دیتا ہے کہ کوئی دوسرا درخت نہیں دے سکتا اور صرف اسی ایک خصوصیت کی بنا پر ہی ہمارے پیار اور ہماری حفاظت کا بجا طور پر مستحق ہے۔

جارج مورس کی نظم کا یہ بند شاندار اور عالی ظرف برگد پر صادق آتا ہے:

اے لکڑہارے! اس درخت کو چھوڑ دے
اس کی کسی ٹہنی کو نہ چھونا
جوانی میں اس نے مجھے پناہ دی تھی
اور اب میں اس کی حفاظت کروں گا۔

مقدّس پیپل

پیپل کے پیڑ ایک طرح سے بڑے ہی خود نما ہوتے ہیں۔ جب ہوا بند ہوتی ہے تب بھی اُن کے خوبصورت پتے لٹّو کی طرح چک پھیریاں کھا کر تمھاری توجہ اپنی طرف کھینچتے اور تمھیں اپنے سائے میں بُلاتے ہیں۔ یہ پتے ٹھنڈی ہوا کے دھارے ہی تمھاری طرف بھیجنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی نوکیلی پتیاں یوں مسلسل ٹکراتی رہتی ہیں کہ ان سے ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے گرنے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پتے تالیاں بجا رہے ہوں۔

اب اگر رشیوں نے دھونی رمانے اور دھیان گیان کے لیے اسی درخت کے نیچے بیٹھنا پسند کیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ پیپل کے پیڑ تلے ہی مہاتما بدھ کو "روشنی" ملی تھی، اسی وجہ سے اس درخت کو "بودھی" یعنی دانش مندی کا درخت کہا جاتا ہے۔

ہندو پیپل کو خصوصیت سے مقدس سمجھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس کی جڑیں برہما کی علامت ہیں، چھال وشنو کی اور ٹہنیاں شیو مہادیو کی! ہندوؤں کی مقدس کتاب "وشنو پران" میں لکھا ہے "جس طرح پیپل کا پورا درخت ایک ننھے سے بیج میں سمایا ہوا ہے اسی طرح ساری کائنات برہما میں سمائی ہوئی ہے"

دیہاتوں میں نئے چاند کی رات جب پیر کے روز پڑتی ہے تو عورتیں پیپل کی پوجا کرتی ہیں، اس کے تنے پر پانی ڈالتی ہیں اور اس کی جڑوں پر تانبے کا سکہ اور مٹھائی رکھتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ پیپل تلے جھوٹ بولنا یا دھوکا دینا خطرناک ہوتا ہے اور کبھی کبھار دکانداروں کو چھیڑنے کے لیے ان سے کہا جاتا ہے کہ انھیں بازار میں پیپل کا پیڑ نہ لگانا چاہیے۔ اس کے باوجود ہمارے یہاں کے بازاروں میں پیپل کے پیڑ خوب ملتے ہیں۔ یہ درخت ہر اُس جگہ اُگ آتا ہے جہاں اس کا بیج گرا

ہو، وہ دیوار ہو یا چھت۔ اور اگر موقع ملے تو دوسرے درخت کے دو شاخوں میں بھی یہ اُگ آتا ہے۔ چونکہ اس کی جڑیں اینٹوں اور چونے میں بھی اپنی جگہ بنا لیتی اور پھیلتی ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ پیپل کو عمارتوں سے بہت دور لگایا جائے۔

کسی دوسرے درخت کے پتے ایسے گاؤدمی اور نوک دار نہیں ہوتے جیسے پیپل کے ہوتے ہیں۔ جب بارش ہو رہی ہو تو تم پیپل کے پتوں کی نوکوں سے پانی کو باقاعدہ ٹپکتے دیکھ سکتے ہو۔ گٹھیلے پتوں کی بہ نسبت سپاٹ پتوں پر سے پانی تیزی سے بہہ جاتا ہے اور پتے جتنی جلد خشک ہو جائیں، درخت کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔
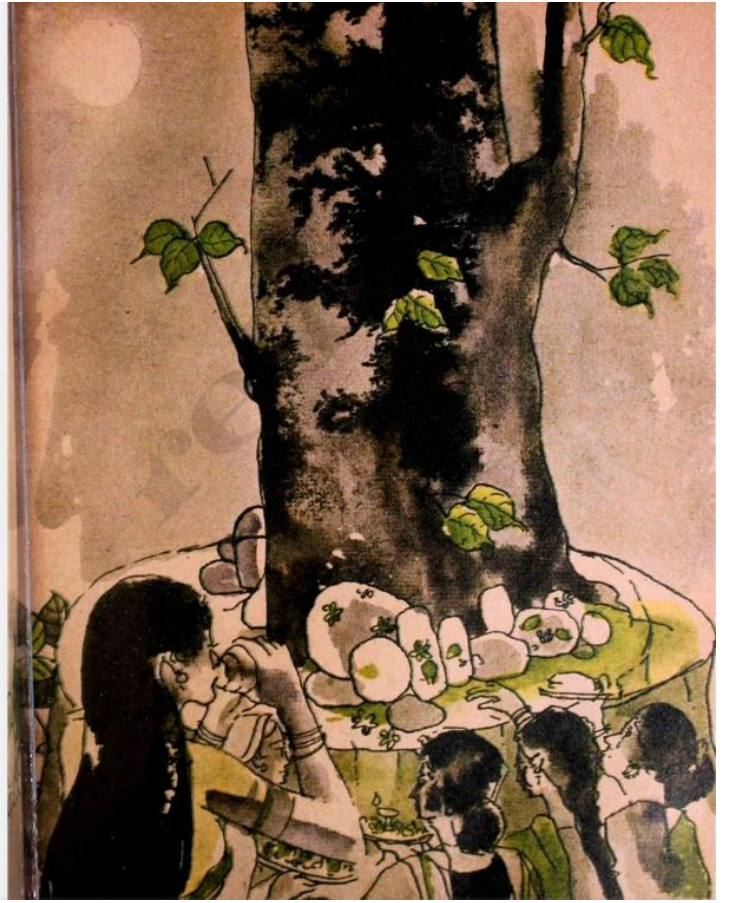
پیپل کا پتہ خوب صورت ہوتا ہے اور مرد کے جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے ڈنٹھل انسان کی گردن سے، پتے کے کنارے دونوں طرف مخروطی سے شانے لگتے ہیں اور پھر گول ہوکر اور اندر کی طرف مڑکر عمدہ دُم (کمر) بن جاتے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پتلی کمر پر سڈول دھڑ ہو۔۔۔ بالکل ایسا ہی جسم جیسا کہ ہمیں بھگوان کرشن کی تصویروں میں نظر آتا ہے۔

برگد میں تو مختلف قسم کے پرندوں اور کیڑے مکوڑے بسیرا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف، پیپل کے پیڑ کے لیے کہا جاتا ہے کہ بھوتوں اور شرارتی روحوں کا مسکن ہوتا ہے۔ ان روحوں میں سب سے زیادہ شرارتی روح "منجیا" ہے۔

یہ روح پیپل کے ان درختوں پر رہتی ہے جو دوسرے درختوں سے الگ اور دور اُگے ہوں۔ منجیا قریب سے گزرتے ہوئے تانگوں، بیل گاڑیوں اور بسوں پر لپکتی اور انھیں اُلٹ دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ہمارے یہاں بڑی بوڑھیاں اب بھی ہمیں ہدایت کرتی ہیں کہ پیپل کے پیڑ تلے سے گزرتے وقت خبردار بھولے سے بھی جماہی نہ لینا اور اگر جماہی روکنا ممکن نہ ہو تو پھر منھ کے سامنے اپنا ہاتھ رکھ لیا کرو یا منھ کے آگے چٹکی بجاؤ۔ "اگر ایسا نہ کیا" بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں "تو پھر یہ منجیا تمھارے کھلے ہوئے منھ میں سے گھُس کر پیٹ میں اُتر جائے گی اور تمھارا ہاضمہ خراب کردے گی۔"

پیپل کے پیڑوں کی عمریں بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ ہردوار میں کئی ایک پیپل بے حد قدیم ہیں، موجودہ شہر سے بھی قدیم بلکہ غالباً گیارھویں صدی کے مہادیوی مندر جتنے پرانے ہیں۔۔۔ 288 قبل مسیح میں یعنی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دو سو اٹھاسی سال پہلے پیپل کا ایک پیڑ ہندوستان سے لے جاکر سری لنکا میں لگایا گیا تھا وہ اب بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ پوری طرح ہرا بھرا بھی ہے۔ اس پیپل کی نشوونما کی تاریخی دستاویز صدیوں سے محفوظ کی جارہی ہے اور اب اس پیڑ کی عمر 2257 برس ہوچکی ہے۔

ایک زمانے میں پیپل کے پیڑ کو کاٹنا اور گرانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا اور دوسری طرف جو شخص پیپل لگاتا تھا اُس پر، کہتے ہیں کہ نسل درنسل برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ آؤ ہم بھی نہ صرف پیپل لگاکر، جو آپ اپنی حفاظت کرلیتا ہے، بلکہ ہر قسم کے درخت لگاکر آنے والی نسلوں کی دعائیں لیں تاکہ آنے والی نسلوں کو سایا، ٹھنڈک، پھل، پھول اور خوبصورتی ملتی رہے اور فائدہ پہنچتا رہے۔

کیسا ہوگا وہ ملک جس میں کوئی درخت نہ ہو؟ ایک صحرا اور ایک ویرانہ! اگر ہم درخت اُگانے کے بجائے انھیں کاٹتے رہے، اگر جنگلات صاف کرتے رہے تو پھر ہمارا ملک بھی ایک صحرا اور ایک ویرانہ بن سکتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو!

آم کا باغ

اگر کوئی شخص کلہاڑا لے کر آم کے درخت پر پِل پڑے کہ اسے کاٹ کر ہی دم لوں گا تو سمجھ لو کہ وہ دیوانہ ہے کیونکہ کوئی صحیح الدماغ شخص آم کے درخت کو کاٹنا پسند نہ کرے گا۔ آم کا ہر درخت، خواہ وہ کسی ویرانے ہیں ہی کیوں نہ ہو، تمھارے لیے میٹھے اور رس بھرے پھل مہیا کرتا ہے۔ آم کو "دیوتاؤں کا مشروب" اور "پھلوں کا بادشاہ" بھی کہا جاتا ہے۔ تم درخت سے پکے ہوئے آم توڑ کر کے کھا سکتے ہو، تم آم کا اچار بنا سکتے ہو، چٹنیاں تیار کر سکتے ہو اور جام بھی۔ تم آم کا رس خشک کر کے اس کا پاپڑ بھی بنا سکتے ہو، تم اس کا رس دودھ میں حل کر کے پی سکتے ہو، حتیٰ کہ تم اس کی گٹھلی پیس کر گیہوں کے آٹے کے بجائے استعمال کر سکتے ہو اور پھر آم کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور ہر قسم کا آم اپنا ایک الگ ذائقہ اور اپنی ایک الگ خوشبو رکھتا ہے۔

آم کی تعریف میں ایسے مشغول ہوئے کہ اس کے درخت کو تو بھول ہی گئے۔ آم کا درخت ہندوستان کے پُرشوکت درختوں میں سے ایک ہے۔ ہمالہ کی تلہٹی سے کنیا کماری تک چلے جاؤ تمھیں ہر جگہ یہ پیڑ اپنی بلند اور گھنی شاخیں پھیلائے بڑی شان سے کھڑا نظر آئے گا۔ غرض "جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا" والا معاملہ ہے اس کے ساتھ۔

گجرات میں اب بھی رواج ہے کہ ساون (جولائی، اگست) کے مہینے کی ساتویں رات کو عورتیں اپنے گھر کے سامنے یا آنگن میں آم کا پودا لگا کر اس کی پوجا کرتی ہیں کہ ان کے بچے بیماریوں سے محفوظ رہیں۔ گنیش جی کی پوجا کے وقت کبھی کبھی آم کی لکڑی کا ایک کھمبا زمین میں گاڑ کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

اگر تم شمالی ہند کے میدانی علاقے میں کہیں رہتے ہو تو تم نے آم کے عظیم درختوں کا جھنڈ دیکھا ہوگا جو کبھی کبھی ریگستان میں نخلستان کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ نخلستان سپاٹ اور وسیع و عریض میدان میں ہوتا ہے۔ اسی جھنڈ میں تمھیں ایک کنواں اور ایک چھوٹا سا مندر بھی نظر آئے گا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں تھکا ہوا اور دھول میں اٹا ہوا کسان اپنا دوپہر کا کھانا کھانے اور سستانے کے لیے آ بیٹھتا ہے۔ جب وہ کھانا کھا چکتا ہے تو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ اگر تم اس وقت اس کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ آم کا یہ باغ کس نے لگایا تھا تو یقین کرو کہ وہ تمھارے اس سوال کا جواب نہ دے سکے گا۔ یہ باغ اُس وقت بھی وہاں تھا جب کسان بچہ تھا شاید اُس وقت بھی ایسا ہی موجود تھا جب اس کا باپ بھی بچہ تھا۔ آموں کے بہت سے باغ تو بے حد قدیم ہیں۔

کبھی تم نے ہزارہا درختوں کے باغ کے متعلق کچھ سنا ہے؟ شاید نہیں؛ لیکن بہار میں واقع شہر ہزاری باغ کا نام تو ضرور سُنا ہوگا۔ وہاں کسی زمانے میں آم کا ایک زبردست باغ تھا جس میں پورے ایک ہزار درخت تھے —— ان میں سے چند درخت آج بھی موجود ہیں —— اس باغ کا نام ہزاری تھا۔ اس باغ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا جو پھیلتے پھیلتے شہر بن گیا اور موجودہ ہزاری باغ کہلایا۔ بہرحال یہ ہے وہ روایت جو اس شہر کے قدیم باشندے بیان کرتے ہیں اور آج بھی یہ شہر آم، نیم، سال اور املی کے پیڑوں سے گویا ڈھکا ہوا ہے۔

آم کے باغ میں ہر ایک جا سکتا ہے لیکن آموں کے موسم میں اگر تم نے وہاں قدم بھی رکھا تو پھر جو کچھ ہوگا اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ اس موسم میں ایک خونخوار چوکیدار اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ ان شریر بچوں کو مار بھگائے جو اس خیال سے دبے پاؤں اور چوری چھپے باغ میں گھستے ہیں کہ چوکیدار سو رہا ہوگا چنانچہ وہ چند آم توڑ بلکہ یوں کہو کہ چرا کر بھاگ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ فصل کے زمانے میں چوکیدار بہت مصروف رہتا ہے۔ آموں کے پکنے سے پہلے بھی اسے نہ صرف گاؤں کے شریر بچوں بلکہ توتوں کے چھاپہ ماردستوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

جو آم کے درختوں پر ہلّہ بول کر نیلے نیلے اور کچّے آموں میں اپنی مڑی ہوئی لال لال چونچیں گھُسا دیتے
ہیں۔ اکثر یہ چوکیدار یوں کرتا ہے کہ باغ کے بیچوں بیچ والے درخت کی بلند ترین ٹہنی سے مٹی کے
تیل کا ایک خالی کنستر باندھ دیتا ہے، پھر اس سے ایک رسّی باندھ کر نیچے لٹکا دیتا ہے اور خود یہ
رسّی پکڑ کر درخت تلے بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں توتوں کے جھنڈ آئے اور اس نے رسّی کھینچی، کنستر
ٹھن ٹھنایا اور توتے خوف زدہ ہو کر اُڑ گئے۔ وہ چیخ چلا کر بھی انھیں بھگا سکتا ہے لیکن اس کی آواز

توتوں کے شور میں ڈوب کر رہ جاتی ہے درخت سے اُڑے ہوئے توتے چند ثانیوں تک وہیں منڈلاتے رہتے ہیں اور پھر اپنی دُمیں پنکھے کی طرح پھیلا کر بلند ترین ٹہنیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

آموں کا موسم نہ بھی ہو، مگر توتے وہیں ہوں گے کیوں کہ انھیں انڈے دینے کے لیے آم کے پُرانے پیڑوں کے گلٹی دار تنوں کے سوراخ ہی پسند ہیں۔ دوسرے پرندے جن میں نیلا جِے بھی شامل ہے، آم کے تنے میں ہی انڈے دیتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک چھوٹا سا اُلّو آم کے کسی پُرانے درخت کے تنے کے ایک سوراخ میں سے، اپنی حسرت بھری گول گول آنکھوں سے تمھیں دیکھ رہا ہوگا۔

حالانکہ آم کی اہمیت اس کے پھل کی وجہ سے ہے، تاہم اس کی لکڑی کے تختے بنا کر ان سے سامان پیک کرنے کے لیے بکس بنائے جاتے ہیں۔ سستے قسم کے دروازے، فرنیچر اور کھڑکیاں بھی آم کی لکڑی سے بنتی ہیں۔ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں آم کے پیڑوں سے پھولوں کی بیلیں لپٹی ہوتی ہیں اور موسم گرما میں یہ بیلیں بوڑھے پیڑ کو پھولوں کا مکٹ پہناتی ہیں کہ اس نے انھیں سہارا دیا۔

سیم درخت پر دعوت

تم چاہے بڈمنٹن نہ بھی کھیلتے ہو مگر تم نے وہ چڑیا، جسے شٹل کاک کہتے ہیں ضرور دیکھی ہوگی جس سے بڈمنٹن کھیلا جاتا ہے۔ اب اگر تم اس چڑیا کو چمک دار سرخ رنگ میں رنگ دو تو تمھیں اس درخت کے پھول کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جسے اُردو میں سیم، ہندی میں سیمل اور گجراتی میں شمڑد کہتے ہیں۔

اچھا اب تم ایک ایسے درخت کا تصور کرو جو کافی اونچا ہے، جس پر ایک بھی پتہ نہیں لیکن جو لال انگارہ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ کر لیا تصور؟ یہی ہے سیم۔ موسم بہار میں یہ درخت ایسا ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت کم درخت ایسے ہوں گے جو سیم کی طرح خوبصورت اور بھڑکدار ہوں۔

تم نے سیم کا درخت کہیں نہ کہیں تو دیکھا ہوگا۔ شلاً جنگل میں، شہر میں سڑک کے دونوں کناروں پر دو رویہ قطاروں میں۔ یہ سائے دار درخت ہے۔ موسم بہار میں البتہ کچھ عرصے کے لیے اپنے پتے جھاڑ کر پھولوں سے لد جاتا ہے۔ موسم گرما میں تم دیکھو گے کہ اس کے بیجوں پر سفید روئی سی جمی رہتی ہے جسے ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی دور دور تک اُڑا لے جاتا ہے۔ یہ روئی سوت بنانے اور کپڑا بننے کے کام نہیں آتی البتہ اسے تکیوں اور گدّوں میں ضرور بھرا جاتا ہے۔

اکثر درختوں کی طرح سیم کو بھی ہمارے یہاں کی دیومالا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مدھیہ پردیش کا ایک قبیلہ ہے "موریہ"۔ یہ لوگ جہاں کہیں اپنا گاؤں بساتے ہیں اس مقام پر آباد ہونے سے پہلے، بالکل بیچوں بیچ سیم کا درخت لگا دیتے ہیں۔ دوسرے قبائلی ہیں جو سیم کی لکڑی سے وہ ستون بناتے ہیں جس کے گرد شادی کی رسم کے وقت، دولہا دولہن پھیرے لیتے ہیں۔ سیم کی لکڑی تراش کر بنائے ہوئے توتے بھی "لگن منڈپ" (شادی کا شامیانہ) میں لگائے جاتے ہیں کیوں کہ توتا "بن دیوی" یا جنگل کی روح کی علامت ہے۔

سیم کی لکڑی بے حد نرم ہوتی ہے اور کھلونے اکثر اسی لکڑی کے بنتے ہیں۔ ماہی گیروں کے جالوں کے کناروں پر جالی کو پانی کی سطح پر اُٹھائے رکھنے کے لیے لکڑی کے جو ٹکڑے بندھے ہوتے ہیں اور جنھیں "تریا" کہتے ہیں وہ عموماً سیم کے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے بیج مویشیوں کو مقوی غذا کے طور پر کھلائے جاتے ہیں اور اس کی چھال سے جو گوند نکلتا ہے وہ دیسی دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔

سیم اپنے بھڑک دار رنگ اور پھولوں کی بہتات کی وجہ سے جتنا زیادہ ممتاز ہے اتنا ہی قابلِ ذکر ان پرندوں کی وجہ سے بھی ہے جو اس پر آتے ہیں۔ کچھ پرندے تو وہ رس پینے آتے ہیں جو اس کے بڑے بڑے سرخ پھولوں میں ہوتا ہے، کچھ پرندے ایسے بھی ہیں جو اُن کیڑوں اور پتنگوں کو کھانے آتے ہیں جو پیالوں جیسے پھولوں میں اور رس میں ڈوب کر مرے پڑے ہوتے ہیں اور کچھ پرندے سیم میں اپنا گھونسلا بنا لیتے ہیں کیوں کہ اس کی نرم لکڑی میں وہ آسانی سے سوراخ کر سکتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ صبح سے شام تک سیم پرندوں سے بھی لدا پھندا رہتا ہے۔

ان روزانہ کے ملاقاتیوں میں سب سے زیادہ کوّے ہوتے ہیں جو دن بھر کی شرارت کا پروگرام بنانے سے پہلے سیم کے پاس اس کی کٹوریوں میں سے رس کی ایک دو چسکیاں لگانے آتے ہیں۔ پھر مختلف قسم کی مینائیں ہوتی ہیں جو جگہ کے لیے آپس میں جھگڑتی ہیں۔ باربیٹ ایسا پرندہ جس کی چونچ کے نیچے بالوں کا گچھا ہوتا ہے، ہوتے ہیں، بلبل ہوتے ہیں اور کوئل ہوتی ہیں اور یہ سارے پرندے ضیافت میں شریک ہوتے ہیں اور خوب شور مچاتے ہیں۔ پرندوں کے علاوہ گلہریاں بھی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھتی اور آپس میں ایک دوسرے سے کچھ کہتی اور اپنی گچھے دار دُمیں ہلاتی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر پھدکتی رہتی ہیں اور اس تمام عرصے میں پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اس طرح گرتے ہیں جیسے برس رہے ہوں۔

گلابی رنگ کا وہ پرندہ جو اوّل درجے کا نقال ہوتا ہے اور جسے انگریزی میں اسٹارلنگ کہتے ہیں ان سب پرندوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اسٹارلنگ اکا دُکا نہیں بلکہ جھنڈ بنا کر آتے ہیں اور ان کا رنگ سیم کے پھولوں سے ایسا میل کھاتا ہے کہ بس دیکھا کیجیے۔ یوں سمجھو کہ یہ پرندے اپنے رنگ کا موازنہ سیم کے پھولوں سے کرتے آتے ہیں اور ایسا ہنگامہ کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ زبردست فساد ہوگیا ہو لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اسٹارلنگ واقعی آپس میں تو تو میں میں کرتے ہیں۔ نہیں بھئی وہ تو خوشیاں مناتے ہیں۔

سیم کے درخت کو اپنا مسکن بنانے والی شہد کی مکھی بھی ہوتی ہے۔ ان کے بڑے بڑے چھتے سیم کی ٹہنیوں سے ٹنگے رہتے ہیں۔ سیم کی سیدھی اور قدرے چپٹی ٹہنیاں ان بڑے بڑے چھتوں کو سہارنے کے لیے بے حد مناسب ہوتی ہیں اور تم جانو کہ ایک چھتے تو پانچ پانچ فٹ لمبے اور ڈھائی ڈھائی فٹ چوڑے ہوتے ہیں۔ ان چھتوں کے رہنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ نر جو کوئی کام نہیں کرتے، مادائیں جو انڈے دیتی ہیں اور کاریگر جو ایسے زبردست چھتے بناتے ہیں۔ یہ مستقل بستیاں ہوتی ہیں جو شہد یا موم یا زردانوں سے بھری رہتی ہیں۔

یہ مکھی جب ڈنک مارتی ہے تو بڑی تکلیف اور سوزش ہوتی ہے، خصوصاً گرمیوں میں ان کے ڈنک میں زہر ہوتا ہے لیکن جنگل میں رہنے والے کول اور سنتھال قبائل اس زہر کے عادی ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب شہد کی مکھی انھیں ڈنک مارتی ہے تو وہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتے لیکن وہ لوگ جو جنگل میں نہ رہتے ہوں چیخ اٹھتے ہیں چنانچہ بہتر یہی ہے کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑا نہ جائے کیوں کہ یہ انسانوں اور جانوروں پر بڑی بے رحمی سے حملہ کر دیتی ہیں۔

دو شکاریوں کی کہانی سنیے جو ماہ مئی کی ایک گرم صبح کو وسطی ہند کے ایک جنگل میں سیم کے ایک درخت کے نیچے سستا رہے تھے۔ اسی سیم کی ٹہنیوں سے شہد کی مکھیوں کے تقریباً درجن بھر چھتے لٹک رہے تھے۔ ایک شکاری اپنا پائپ جلانے کی حماقت کر بیٹھا۔ پائپ سے دھواں نکل کر اوپر پہنچا اور شہد کی مکھیاں جھنجھلا کر ان پر ٹوٹ پڑیں۔ شکاری دُم دبا کر بھاگے اور ایک میل تک بھاگتے چلے گئے اور تب جا کر انھیں دریا میں پناہ مل سکی۔ یعنی وہاں تک ان مکھیوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور انھوں نے اس بُری طرح اور ایسی بے دردی سے ڈنک مارے تھے کہ وہ غریب کئی گھنٹوں تک دریا میں اسی طرح رہے کہ پانی ان کی ٹھوڑیوں تک آتا تھا، تب کہیں جا کر سوزش کم ہوئی۔

جنگل کی آغوش میں

لڑکا ہو یا لڑکی اور چاہے وہ شہر میں ہی کیوں نہ رہتا ہو لیکن وہ سال اور مہوہ کے درختوں سے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہمارے جنگلوں میں اُگنے والے درختوں میں یہ دونوں درخت خاصی قدر و قیمت کے مالک ہوتے ہیں۔

سال کے درخت کو شہر میں بھی لگایا جا سکتا ہے لیکن اُسے تنہائی پسند نہیں۔ وہ تو شمالی اور وسطی ہندوستان کی مرطوب ترائی میں اور سطح مرتفع کے جنگلوں میں ہی اپنے کنبے کے دوسرے درختوں کے ساتھ ہی خوش رہتا ہے۔ یہ عمارتی لکڑی کا بڑا ہی بیش قیمت درخت ہے اور شمالی ہند کی عمارتوں میں زیادہ تر سال کی ہی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن صرف اس کی لکڑی ہی کارآمد نہیں ہے، اس کے تنے کو چھیلا کر اس میں سے ایک قسم کی رال نکالی جاتی ہے جو ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں عود و عنبر کی طرح جلائی جاتی ہے۔ اس رال سے کشتیوں اور جہازوں کی درزیں بھی، جو تختوں کے جوڑوں کے درمیان ہوتی ہیں، بند کی جاتی ہیں۔ اس کے بڑے چمک دار پتے بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔ بہار کے سنتھال قبیلے کے لوگ روزانہ سال کے پتے جمع کر کے انھیں کھانے کے برتنوں کی جگہ استعمال کرتے ہیں، وہ بڑی مہارت سے ان تینوں کو جوڑتے ہیں اور ان میں رکھ کر دال چاول کھاتے ہیں۔ وہ ایک بڑے پتے کو موڑ کر ایک پیالہ بناتے ہیں، جس میں سے پانی نہیں گرتا۔

سال کے پتے گھر بنانے کے کام بھی آتے ہیں لیکن انسانوں کے نہیں بلکہ چیونٹیوں کے!

سرخ چیونٹی کا گھر سال کے تازہ ہرے یا خشک پتوں سے بنا ہوتا ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ چیونٹی پتے چپکاتی کیسے ہے؟ کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں وغیرہ جب انڈوں سے نکلتی ہیں تو ان کی اس ابتدائی حالت میں ایک قسم کا گوند نکلتا ہے اور اسی گوند سے بڑی چیونٹی یہ پتے چپکا کر اپنا گھر بناتی ہے۔ اگر تمھیں سرخ چیونٹی کا ایسا گھر کہیں نظر آجائے تو اسے چھیڑنا نہیں کیوں کہ وہ چیونٹیوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ اور ہاں۔ ان چیونٹیوں کو پالنے اور رام کرنے کی بھی کوشش نہ کرنا کیوں کہ یہ بھی بھڑوں کی طرح بڑی ہی تند خو، جنگ جو اور خطرناک ہوتی ہیں۔ اکثر شکاریوں کو، جب وہ ہاتھی کے شکار کو گئے ہیں اور بے خبری میں چیونٹیوں کے گھر کو چھیڑ بیٹھے ہیں، اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

سال میں اپنا گھر بنانے والا دوسرا کیڑا ہے ٹڈا۔ تم نے اسے گرمیوں کے گرم دنوں اور بارشوں میں گاتے سُنا ہوگا۔ ایک ہی ٹڈا بڑا بلند بانگ ہوتا ہے اور اس کی آواز بھی تیکھی ہوتی ہے اور جس جنگل میں بہت سے ٹڈے ترنگ میں آکر گا رہے ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بہت سے سازندے اپنے ساز درست کر رہے ہیں اور جن کے ہر ساز سے مختلف قسم کے سُر نکل رہے ہوں۔ ٹڈوں کی اس پُرشور موسیقی کو سُن کر دوسرے پرندے بھی سہم کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

لیکن صرف ٹڈا گاتا ہے۔ ٹڈی بچاری تو گونگی ہوتی ہے۔

وسطی ہند کے بعض قبائل میں سال کو پیپل کا سا ہی تقدس حاصل ہے۔ مارچ کے مہینے میں جب سال پر پھول آتے ہیں تو ایک تیوہار منایا جاتا ہے جسے "با بھونگا" کہتے ہیں۔ شادی کے وقت جو شامیانہ لگایا جاتا ہے اس میں ایک بلّی یا کھمبا سال کا ضرور ہوتا ہے، جس پر تیل اور ہلدی چپڑی ہوتی ہے۔ اگر دولہا یا دولہن میں سے کسی کو یہ شادی منظور نہیں ہوتی تو وہ سال کا ایک پتہ لے کر پھاڑ دیتا ہے اور شادی رک جاتی ہے۔

روایت ہے کہ مہاتما بدھ کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ نے ہاتھ بڑھا کر سال کے درخت کی ایک شاخ پکڑی تھی اور پھر مہاتما بدھ کو جنم دیا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب مہاتما بدھ کی وفات ہوئی تھی تو سال کے درختوں نے ان سے اظہارِ عقیدت یوں کیا تھا کہ ان پر سایہ کرنے کے لیے اپنی شاخیں جھکا دی تھیں اور ان پر پھول برسائے تھے حالانکہ وہ پھولوں کا موسم نہ تھا۔

جنگل میں اُگنے والا دوسرا درخت خوبصورت مہوا ہے جو قبائلی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مہوا کے پھول کھائے جا سکتے ہیں، کچے بھی اور پکا کر بھی۔ گونڈ قبیلے کے لوگ اور خصوصیت سے وسطی اور مغربی ہند کے دوسرے قبائلی مہوا کے پھول بطور غذا کے استعمال کرتے ہیں یعنی ان کے کھانے میں ان پھولوں کی سبزی ضرور ہوتی ہے اور جب بارشیں نہ ہوئی ہوں اور چاول میسر نہ ہو تو ان کی روزانہ کی غذا یہی پھول ہوتے ہیں۔

مہوا کے بیجوں سے ایک قسم کا تیل نکالا جاتا ہے جس سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے گھی کی طرح کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔ یہی تیل صابن بنانے کے کام میں بھی آتا ہے۔

موسم گرما کے شروع ہوتے ہی مہوا پر پھول آجاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب قبائلیوں پر عموماً تنگ وقت پڑتا ہے۔ چونکہ کاشت کاروں کے لیے یہ موسم مناسب نہیں ہوتا اور ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اس لیے مہوا چننے کا ایک مشغلہ بلکہ ایک مصروفیت ان کے ہاتھ آجاتی ہے اور اکثر دفعہ تو پورا گاؤں ہی مہوا پر پل پڑتا ہے۔ یہ لوگ یوں بھی کرتے ہیں کہ مہوا تلے اُگی ہوئی گھاس کو جلا دیتے ہیں تاکہ پھول آسانی سے اکٹھے کیے جا سکیں۔ عورتیں سروں پر ٹوکریاں رکھے آتی ہیں اور بچے جھاڑوؤں سے لے کر ہوتے ہیں کہ جب گرے ہوئے پھول چُن لے جائیں تو وہ جھاڑو دے کر نئے پھولوں کے ٹپکنے کے لیے میدان صاف ستھرا کریں۔

مہوا صرف پندرہ دن تک ہی ٹپکتا ہے اور اس مدت تک گاؤں کی کل آبادی جنگل میں

ہی رہتی ہے اور جتنی تیزی سے عورتیں اور بچّے پھول چنتے ہیں اُتنی ہی تیزی سے مرد ان کے بھرے ہوئے ٹوکرے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

پھر ان پھولوں کو ایک میدان میں، جو اسی غرض سے صاف کیا گیا ہوتا ہے، خشک ہونے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔ خشک ہو کر یہ پھول آدھے رہ جاتے ہیں یعنی ہر پتہ سکڑ کر اپنے حجم سے آدھا رہ جاتا ہے اور رنگ بھی سفید سے بھورا بن جاتا ہے۔ مہوا کو یوں بھی، یعنی بغیر کسی ملاوٹ کے بھی کھایا جا سکتا ہے لیکن ذایقہ بڑھانے کے لیے کبھی کبھار سال کے بیجوں کو چاول میں ملا کر بھی پکایا جاتا ہے۔ پہلے مہوا کو ابالا جاتا ہے، پھر سال کے بیجوں کو، جو پہلے سے ہی خشک کر کے بھون لیے گئے ہوتے ہیں، تھوڑے سے چاولوں میں ملا دیا جاتا ہے اور یوں ایک خاص کھانا تیار ہو جاتا ہے جسے قبائلی بڑے شوق اور چاؤ سے کھاتے ہیں۔

وحشی جانوروں کو، خصوصاً ریچھ کو مہوا بہت پسند ہے۔ لیکن اسے توڑنے کے لیے نہ تو آدمیوں کو پیڑ پر چڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی جانوروں کو۔ مہوا رات کو کھلتا ہے اور پو پھٹتے ہی پھول ٹپکنے لگتے ہیں۔

اونچے لمبے تاڑ کے پیڑ

آیندہ جب کبھی تم بحرِ ہند کے کسی ساحل پر سیر و تفریح کے لیے نکلو تو ذرا اوپر نظر کرنا تو تاریکی کے بڑھتے ہوئے پس منظر میں بڑی بڑی مکڑیاں اوپر چڑھتی معلوم ہوں گی۔ مگر وہ

دراصل سڈول اونچے تاڑ کے پیڑوں کی چوٹیاں ہوتی ہیں جو ہر دم ہلتی رہتی ہیں چاہے ہوا بالکل ہی بند ہو۔ جب طوفان آتا ہے یا تیز سمندری ہوائیں چلتی ہیں تو ناریل کے پیڑ جیسے کرب کے عالم میں اپنے سر ادھر اُدھر ہلاتے اور اتنے جھک جاتے ہیں کہ ان کی چوٹیاں زمین کو تقریباً چھو لیتی ہیں۔

پوری عمر کو پہنچے ہوئے اکثر تاڑ (پام) بے حد خوبصورت ہوتے ہیں۔ دورِ قدیم کے ایک ماہر نباتیات کا کہنا ہے۔ "جیسے آسمان سے تیر پھینکے گئے ہوں"۔ لیکن اکثر دفعہ لوگ اپنے جھونپڑوں کی چھت ڈالنے، چولھا جلانے کے لیے ان کی ٹہنیاں کاٹ کر ان کا حُسن بگاڑ دیتے ہیں۔

تاڑ کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہندوستان میں چار قسمیں زیادہ مشہور اور کثرت سے پائی جاتی ہیں اور وہ ہیں ناریل، تاڑ، کھجور اور سپاری۔ یہ سب تاڑ کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ان چاروں کا اپنا الگ الگ حُسن ہوتا ہے اور چاروں ہی اپنے پھل، رس یا ریشوں کی وجہ سے اہم اور مشہور ہیں۔ 1583 میں ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے ایک انگریز نے پہلی دفعہ ناریل کا پیڑ دیکھا تو اپنے گھر خط لکھا کہ "یہ درخت سال بھر پھل دیتا ہے اور یہ کھجور نہیں ہوتی بلکہ انسان کے سر کی طرح سخت اور گول پھل ہوتے ہیں"۔

ہندوستان میں ناریل کے پیڑ دورِ قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ان کا ذکر "پرانوں" اور دوسری قدیم کتابوں میں ملتا ہے۔ عرب ملاحوں اور تاجروں نے ناریل کو "جوزِ ہندی" کہا ہے۔ مشہور سیاح مارکو پولو تیرھویں صدی میں مالابار کے ساحل پر پہنچا تو اس نے بھی ناریل کے لیے عربوں کا دیا ہوا ہی نام اپنایا۔ کوئی نہیں جانتا کہ ناریل سب سے پہلے کہاں اُگا۔ اس کے متعلق بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان نے اس پیڑ کو دور دور تک پہنچایا ہے۔ پرانے زمانے میں "تامل ناڈ" کے لوگ ماہر جہاز راں تھے چنانچہ انھوں نے اور ان کے ساتھ بنگال کے ملاحوں نے ناریل کو جنوبی مشرقی ایشیا کے وسیع علاقے میں متعارف کرایا تھا۔

ناریل کا تیوہار 'ناریل پورنیما' برسات کے موسم کے آخر میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہزاروں لوگ سمندر کے ساحلوں پر جاتے اور ناریل سمندر کی نذر کرتے ہیں۔ ماہی گیر اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں 'جنھیں "مچھوے" کہتے ہیں' بیٹھ کر سمندر میں دور تک جاتے ہیں اور وہاں دودھ،

تیل اور ناریل بہاکر چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح وہ ویدی دیوتا "ورونا" کی پوجا کرتے ہیں۔ اس دیوتا کی علامت ایک صراحی ہوتی ہے جس کے منہ پر ناریل رکھا ہوا ہوتا ہے۔

بہت کم درخت ناریل کی طرح کارآمد ہوں گے۔ اس کے پتوں سے جھاڑو بنائی جاتی ہے۔ اس سے تاڑی بھی بنائی جاتی ہے اور گڑ اور شکر بھی۔ ناریل کے اوپری خول کے ریشوں سے رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اور ناریل کا پانی بڑا ہی خوش ذائقہ اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ ناریل کا گودا خشک کیا جائے تو اسے "کھوپرا" کہتے ہیں جس سے تیل کشید کیا جاتا ہے۔ یہی تیل "ناریل کا تیل" کے نام سے بازاروں میں بکتا ہے اور کچے ناریل کا گودا تو لذیذ اور قوت بخش غذا ہے ہی۔

ناریل ہمارے یہاں کا غالباً سب سے مشہور و مقبول پیڑ ہے لیکن دوسرے پام بھی اتنے ہی اہم ہیں۔ مثلاً "تاڑ" کا پیڑ۔ جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا تو تاڑ کے پنکھوں جیسے پتوں سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا۔ ہندو مذہب اور بدھ مت کی زیادہ تر مقدس کتابیں "تاڑ" کے پتوں پر ہی لکھی گئی تھیں۔

تاڑ ناریل کی بہ نسبت کم کارآمد نہیں ہوتا۔ اس کے تنے سے چھتوں کے شہتیر بنتے ہیں، پتوں

سے چھت ڈالی جاتی ہے اور اس کا رس سورج نکلنے سے پہلے "نیرا" کہلاتا ہے اور اسے پینے سے بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔

چکنی ڈلی یا سُپاری (چھالیہ) تو سبھی نے دیکھی ہوگی۔ لیکن تم میں سے بہت کم بچوں کو معلوم ہوگا کہ یہ سُپاری بہت پتلے اور بہت اونچے پام پر اُگتی ہے۔ سُپاری کے پیڑ ہمارے یہاں کے ساحلی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اب اگر تم ان پیڑوں کے جھنڈ کے آس پاس کہیں رہتے ہو تو تم نے سُپاری کے عمودی اور چکنے پیڑوں پر پھر پرے اور پھرتیلے نوجوانوں کو چڑھتے دیکھا ہوگا۔ سپاری کے پیڑ ایک دوسرے کے بہت قریب اُگے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ ایک نوجوان جب ایک درخت پر سے سُپاری توڑ لیتا ہے تو ذرا آگے کی طرف جھک کر آسانی سے دوسرے پیڑ پر پہنچ جاتا ہے۔ تم جانو ایک پیڑ پر سے اتر کر سُپاری توڑنے کے لیے دوسرے پیڑ پر چڑھنے کی بہ نسبت یوں ہی اوپر ہی اوپر ایک سے دوسرے پیڑ پر پہنچ جانا کہیں آسان کام ہے۔

سُپاری کا پیڑ بڑا ہی نازک ہوتا ہے چنانچہ اسے اگانے کے لیے احتیاط ضروری ہے۔

ہندوستانی کھجور سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے لیکن کھجور کا پیڑ اپنے وجود سے باغوں کو زینت بخشتا ہے۔ اکثر باغوں میں تم نے کھجور کے پیڑ کو دوسرے درختوں اور جھاڑیوں سے بلند اپنے گنجان پتے پھیلائے دیکھا ہوگا۔ ہر سال ایک خاص موسم میں اس میں سنہری کھجوریں لگتی ہیں جن کے گچھے دھوپ میں چمکتے ہیں لیکن یہ کھجوریں صرف پرندوں ہی کے لیے ہوتی ہیں جو کہ

ترش اور تلخ ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے ذایقے اور مذاق پر پوری نہیں اُترتیں البتہ اس کھجور کے رس سے شکر ضرور بنتی ہے۔

عموماً ہم یہی سمجھتے ہیں کہ پام (تاڑ) کے پیڑ ساحل سمندر پر ہی اُگتے ہیں لیکن ہمارا یہ خیال کھجور کے معاملے میں غلط ثابت ہوجاتا ہے کیوں کہ کھجور تو پورے ملک میں ہر جگہ حد یہ کہ ویران ترین مقامات پر بھی اُگ آتی ہے اور پھر پام کی وہ قسم جسے "ساگو" کہتے ہیں ہمالیہ کی ترائی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے پتے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو سخت اور مثلث نما ہونے کی وجہ سے مچھلی کے پروں کی شکل سے مشابہ ہوتے ہیں چنانچہ اسی مناسبت سے "ساگو" کا نام انگریزی میں "فش ٹیل" یعنی "مچھلی کی دُم" ہی پڑگیا۔ لیکن جب یہ پتے بڑے ہوکر پوری طرح سے کھل جاتے ہیں تو پھر ہندوستانی تاڑ کے قبیلے کے پیڑوں کے پتوں میں سب سے بڑے پتے یہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے بڑے پتے ساگو کا گویا سنگھار کرکے حسین بنادیتے ہیں لیکن یہی پیڑ بڑھاپے میں کسی بہت بوڑھے آدمی کی طرح گنجا ہوجاتا ہے اور پھر اس بچارے کی طرف نہ تو کوئی متوجہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی تعریف میں کچھ کہتا ہے۔

"ساگو" سے کئی ایک ضروری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کے ریشوں سے رسّے بٹے جاتے ہیں اور اس کے گودے سے ایک قسم کا آٹا، جو سابو دانہ کی طرح ہوتا ہے، بنایا جاتا ہے جس سے پہاڑی لوگ قحط سالی کے زمانے میں اپنی بھوک مٹاتے ہیں۔

درختوں کی روحیں

ہندوستان کے درختوں کی داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک کہ یہاں کے عام اور ہر جگہ پائے جانے والے درختوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہماری مراد نیم، املی، ڈھاک اور چمپا سے ہے اور جب ان درختوں کا ذکر کیا جائے تو ان روحوں اور دیوتاؤں کا بیان بھی ضروری ہے جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان درختوں پر رہتے ہیں۔

جب بارشوں میں نیم کی نبولیاں یا ڈوڈے زمین پر گرتے اور ہمارے تمھارے قدموں تلے کچلے جاتے ہیں تو ان سے ایک قسم کی خوش گوار مہک نکلتی ہے جو کئی دنوں تک فضا میں موجود رہتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نیم اکثر درختوں سے زیادہ آکسیجن خارج کرتا ہے۔ دورِ قدیم کے داناؤں نے یہ غلط نہیں کہا کہ سب سے زیادہ ہوا صاف کرنے والا قدرت کا کارندہ نیم ہوتا ہے اور اس کے پتّے، چھال اور پتلی ٹہنیاں طبّی حیثیت سے بڑی مفید ہیں کیوں کہ آج بھی نیم کی بہت سی چیزیں بطور دوا استعمال کی جاتی ہیں۔

بہت پہلے سے نیم کو ان دیوتاؤں سے منسوب کیا جا رہا ہے جو ہمیں ہر بیماری سے محفوظ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ تو نیم کو چیچک کی دیوی 'سیتلا' کی طرح مقدس سمجھتے ہیں اور اسی سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ جب بچے بیمار ہو جاتے ہیں تو ان پر نیم کی پتیوں بھری ٹہنی پھیری جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نیم اسی مشروب سے پیدا ہوا ہے جسے دیوتا پیتے ہیں اور لوگ اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر پاک و صاف کرنے کی غرض سے اب بھی اس کے پتّے چباتے ہیں۔

نیم کو سورج سے بھی منسوب کیا گیا ہے جس کی وضاحت نیم بارک کی کہانی "نیم کے درخت میں سورج" میں کر دی گئی ہے۔

کہانی یوں ہے کہ سورج دیوتا نے ایک بیراگی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا لیکن بیراگی نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ دن کی روشنی کے علاوہ کسی اور وقت کھانا نہیں کھائے گا۔ کھانا تیار ہونے میں دیر ہوگئی اور اندھیرا اترنے لگا تو بیراگی نے سوچا کہ آج اسے بھوکا ہی رہنا پڑے گا لیکن سورج نرائن (سورج دیوتا) نیم کے پیڑ پر جمے رہے اور اس طرح جب تک کھانا ختم نہ ہوگیا روشنی باقی رہی۔

دنیا کے ابتدائی دور کے انسان کے لیے درخت حیرت واستعجاب کا باعث تھے ان کی نشوونما کے اسرار، ان کے پتوں اور ٹہنیوں کی جنبش، موسم خزاں میں جیسے ان کی موت اور پھر موسم بہار میں نئی زندگی، بیج سے پھوٹتا ہوا پودا — یہ سب باتیں ان لوگوں کے لیے معجزہ تھیں اور اب بھی یہ قدرت کے معجزے ہی ہیں!

درخت کی اسی معجز نما نشوونما کی وجہ سے لوگوں کو یہ یقین ہونے لگا کہ ان پر روحوں یا دیوتاؤں کا قبضہ ہے چنانچہ درخت کا احترام اسی روح یا دیوتا کا احترام ہے جس کا قبضہ اس پر تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ اس اعتقاد کی وجہ سے یہ بھی ہونے لگا کہ کسی بھی درخت کو کاٹنے سے پہلے آدمی اس سے معافی مانگے۔ رات کے وقت بھی درخت کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا کیوں کہ اس طرح درخت کی روح کی نیند خراب ہو سکتی ہے۔ درخت کاٹنے کے بعد لکڑہارا تنے کے ٹھنٹھ پر گھی ڈال کر کہتا ہے "اے جنگل کے مالک اس سے تیری سینکڑوں ہزاروں کونپلیں پھوٹیں اور تو خوب پھولے پھلے۔"

برار میں ایک جنگل ہے جو قریبی مندر سے منسوب ہے اس جنگل کے کسی بھی درخت کو کاٹنے اور خریدنے کی ممانعت ہے۔ کوئی بھولے سے بھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ متھرا، جہاں بھگوان کرشن کا بچپن گزرا، کے قریب درختوں کے مقدس جھنڈ صدیوں سے محفوظ چلے آرہے ہیں لیکن آج حال یہ ہے کہ اور تو اور مقدس جنگلات بھی معدوم ہوتے چلے جارہے ہیں اور ان کی جگہ انسانوں کے لیے عمارتیں بن رہی ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے یہ، کیوں ہر انسان کو اپنے لیے ایک درخت کی تو ضرورت ہے ہی، اگر پوجا کرنے کے لیے نہیں ہے تو کم سے کم پیار کے لیے تو ہے۔
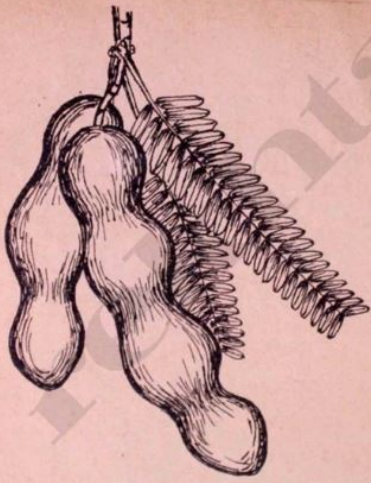
املی کا پیڑ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں پسندیدہ ہے۔ گوالیار میں، اکبر کے دربار کے

مشہور گویّے، تان سین کے مزار پر املی کا ایک قدیم پیڑ کھڑا ہے۔ ہر نیا پُرانا گویّا اپنی آواز میں مٹھاس لانے اور قائم رکھنے کی غرض سے اس درخت کے پتے ضرور چباتا ہے۔

املی کے پتے سبزی سالن میں ڈالے جاتے ہیں اور اس کا پھل، جس کا نام بھی املی ہی ہے، بطور غذا اور دوا کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بیج بھی بیکار نہیں جاتے، بڑا ہی دلچسپ اور حیرت انگیز استعمال ہے ان کا۔ انھیں پیس کر ایک طرح کی لیہی بنائی جاتی ہے جس سے کتابوں کی جلدیں چپکائی جاتی ہیں۔

سڑک کے کنارے اُگنے والا ایک اور درخت چمپا ہوتا ہے جس کے موم کے سے پھول گرمی کی شاموں میں اپنی خوشبو سے اردگرد کی فضا کو مہکائے رکھتے ہیں۔ چمپا کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کئی ایک چھوٹے بلکہ یوں کہو کہ پست قامت ہوتے ہیں اور کئی ایک بلند قامت اور پُرشوکت ہوتے ہیں۔ چمپا کی لکڑی پر پالش بہت عمدہ ہوتی ہے چنانچہ اس لکڑی سے فرنیچر بنایا جاتا ہے اور پھول زیادہ تر مذہبی رسومات میں استعمال کیے جاتے ہیں۔
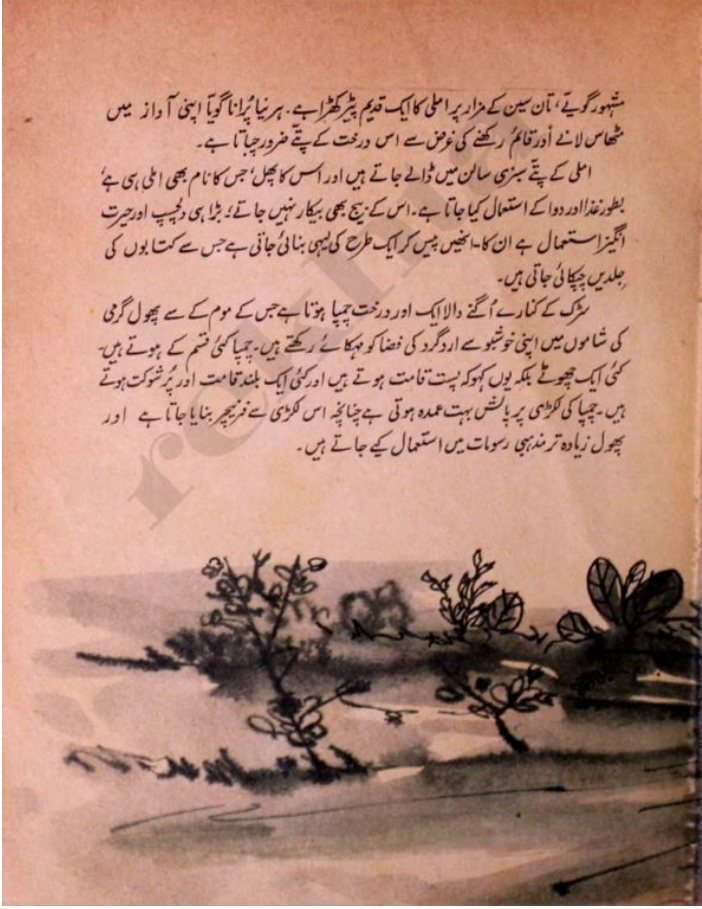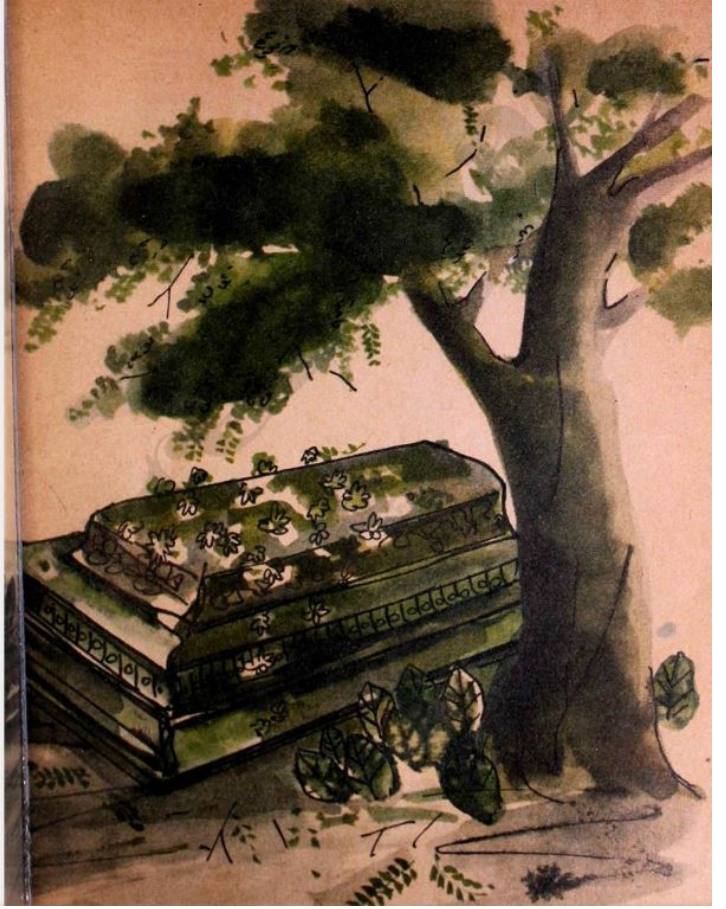
احمد آباد میں ایک ولی کے مزار پر چمپا کا ایک پیڑ ہوا کرتا تھا۔ اور شاید اب بھی ہے — جس کی ٹہنیوں پر کانچ کی چوڑیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی تھی وہ چوڑیاں لے کر مزار پر آتے تھے، ہر غرض مند اپنی حیثیت کے مطابق چوڑیاں لاتا تھا — اگر ولی اس غرض مند کی دعا قبول کرتے تو چمپا کا پیڑ اس کے ہاتھ سے چوڑیاں لے کر اپنی ٹہنی میں پہن لیتا تھا۔
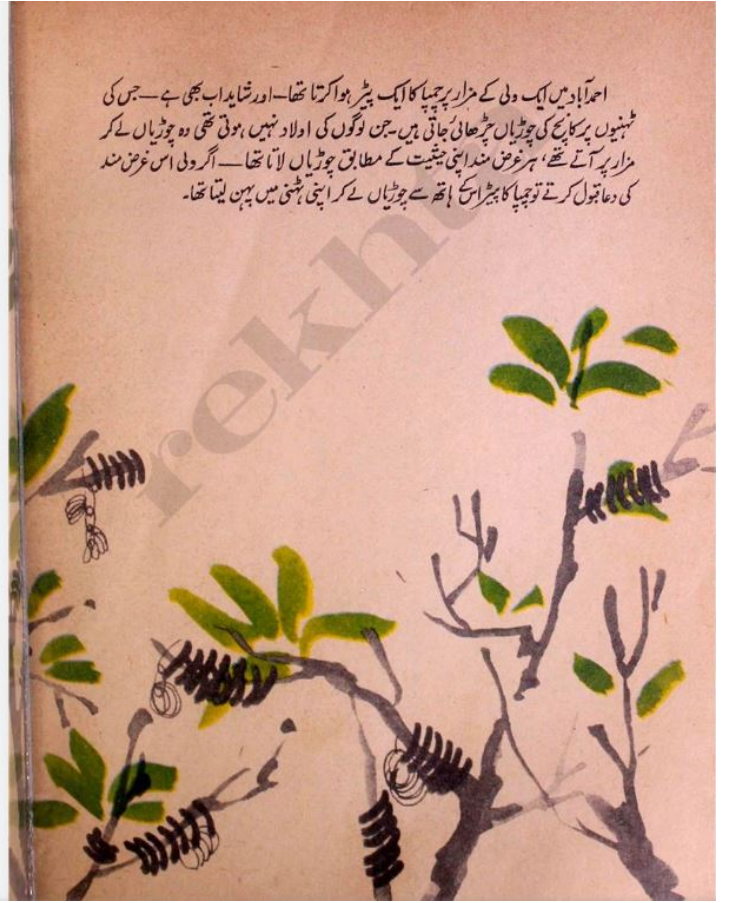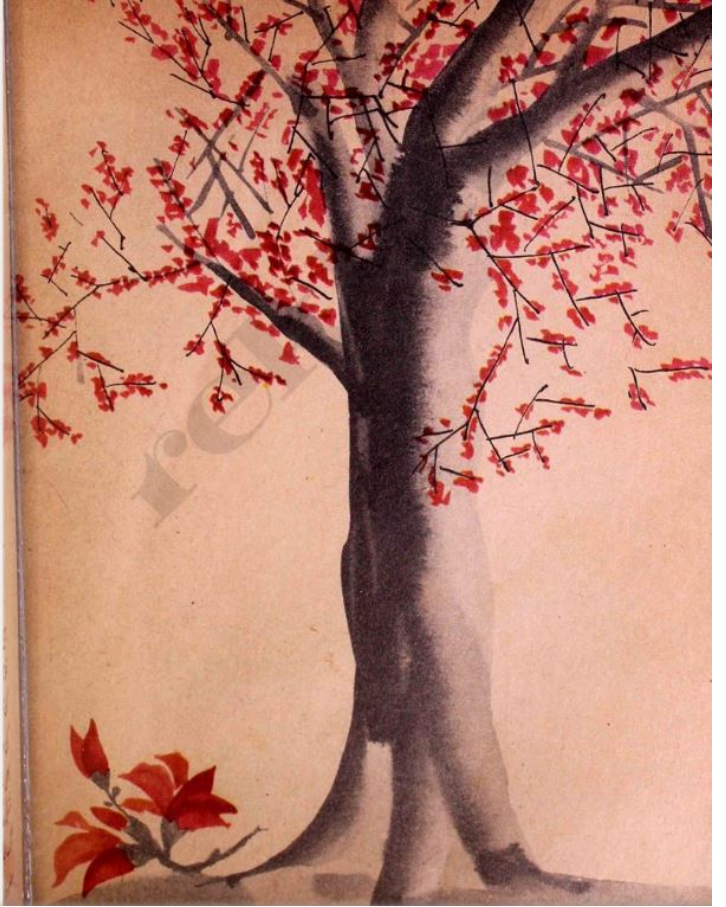
ایک اور قابلِ دید اور نظر فریب درخت ہے "ڈھاک" یا "پلاس" جس کے نام پر پلاسی کے میدانِ جنگ کا نام پڑا۔ اس درخت کی یہ عجیب عادت ہے کہ جب اس میں پھول آتے ہیں تو یہ اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے اور اس کی ٹہنیوں پر پھول ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے یہ درخت نارنجی رنگ کی پچکاریاں مار رہا ہو۔ ان پھولوں سے کبھی کبھی ہولی کے موقع پر گلال بنایا جاتا ہے اور اس کی لکڑی جلاکر مختلف رسومات کی ادائیگی کی جاتی ہے۔

ببول جسے کیکر بھی کہتے ہیں، کا پیڑ دیکھنے میں تو ذرا بھی خوبصورت نہیں ہوتا لیکن اس کی قدر اس کی لکڑی اور چھال کی وجہ سے ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ پیڑ تقریباً ہر جگہ، مثلاً ریگزار اور دلدل میں بھی اُگ جاتا ہے۔ ببول کی لکڑی مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے

چنانچہ اس سے بیل گاڑیوں کے پہیے، کنوئیں کی جگت، کولھو، اوکھلی، موسل اور ہل اور گھر میں اکثر استعمال ہونے والا سامان بنایا جاتا ہے۔ اس کی پھلی مویشیوں، بکریوں اور بھیڑوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

ہر درخت سے کوئی نہ کوئی روایت اور اعتقاد وابستہ ہے جس کی جڑیں قدیم زمانے تک پہنچتی ہیں، اُس زمانے تک جسے قبل از تاریخ کا دور کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اُگنے والے تمام درختوں کا ذکر تو یہاں ممکن نہیں ہے لیکن ہمیں یہ عہد کر لینا چاہیئے کہ جب بھی اور جہاں بھی ہمیں موقع ملے گا ہر قسم کے درخت اُگائیں گے۔
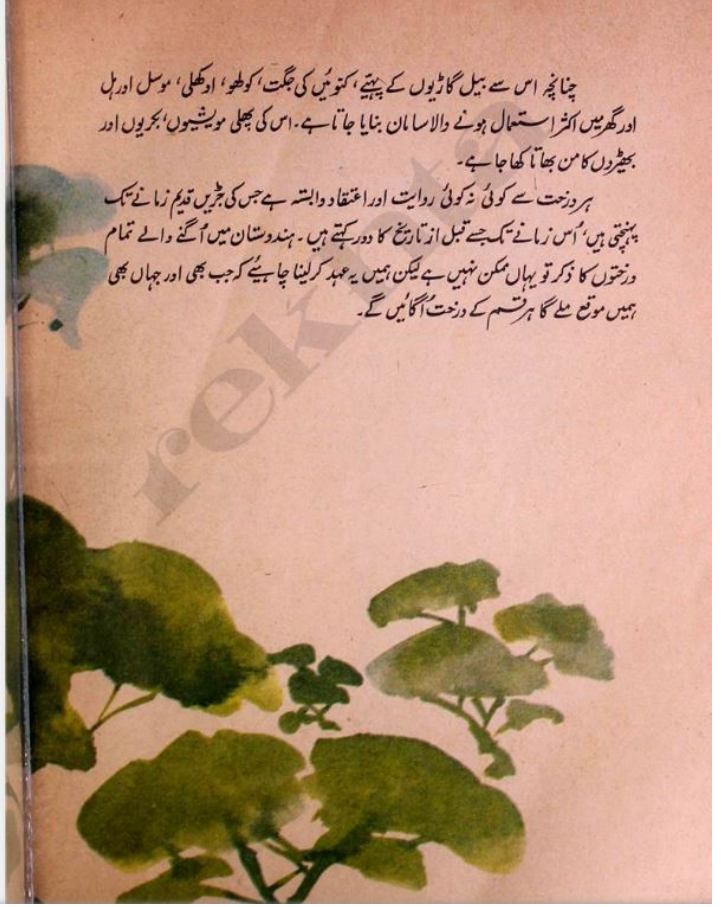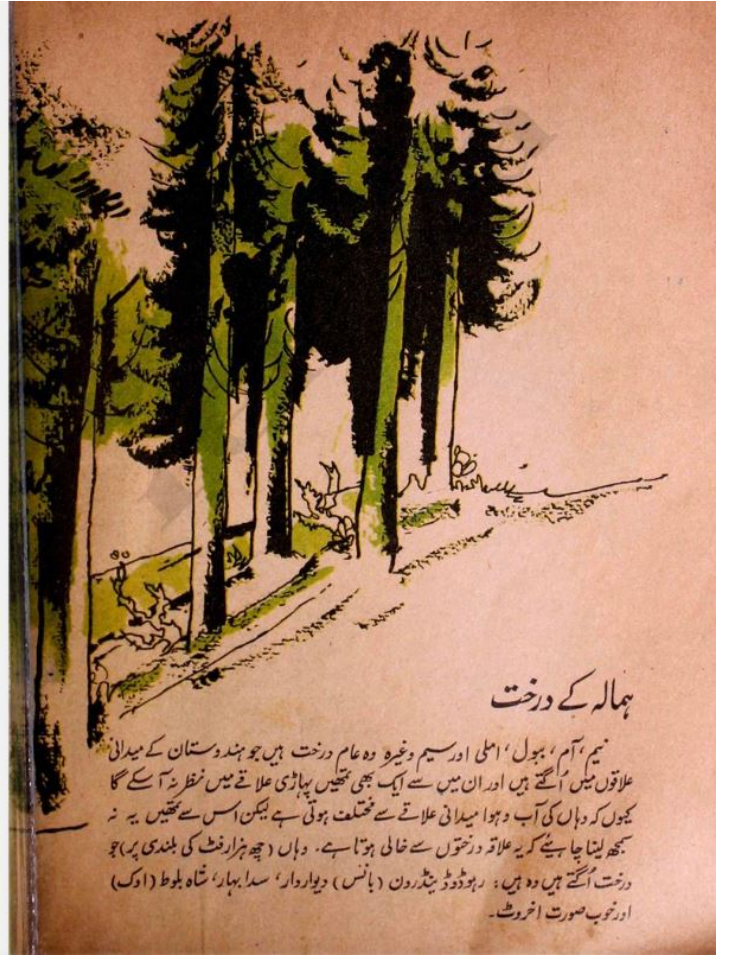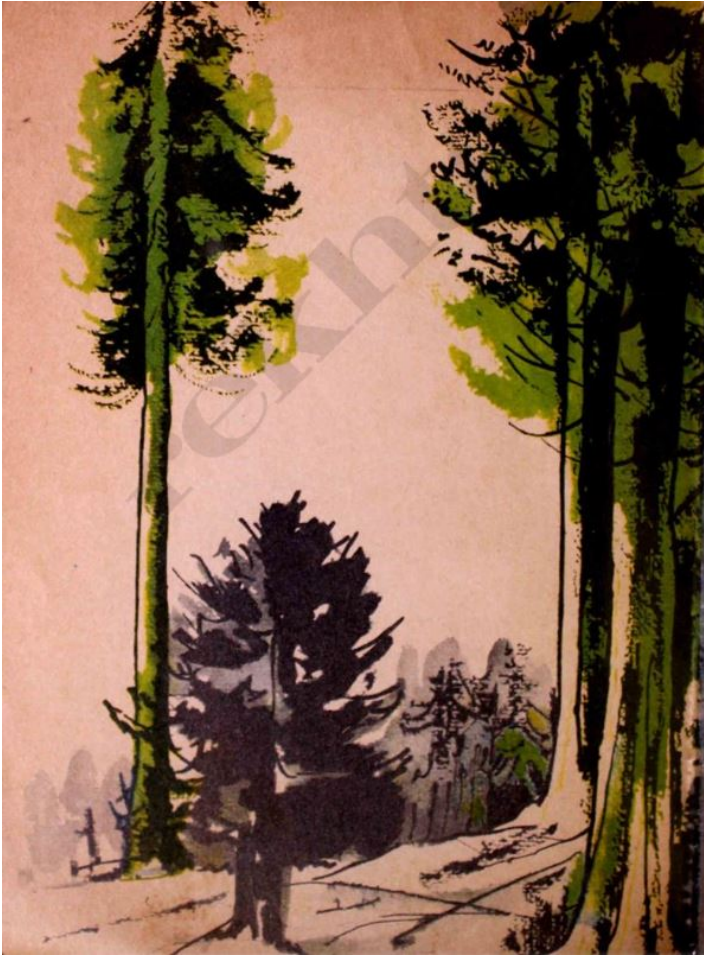
ہمالہ کے درخت

نیم، آم، ببول، املی اور سیم وغیرہ وہ عام درخت ہیں جو ہندوستان کے میدانی علاقوں میں اُگتے ہیں اور ان میں سے ایک بھی تمھیں پہاڑی علاقے میں نظر نہ آسکے گا کیوں کہ وہاں کی آب و ہوا میدانی علاقے سے مختلف ہوتی ہے لیکن اس سے تمھیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ علاقہ درختوں سے خالی ہوتا ہے۔ وہاں (چھ ہزار فٹ کی بلندی پر) جو درخت اُگتے ہیں وہ ہیں: رہوڈوڈینڈرون (بانس) دیوار دار، سدا بہار، شاہ بلوط (اوک) اور خوب صورت اخروٹ۔

دیودار سنسکرت کے "دیودر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: 'شجرِ دیوتا' اور جو بھی دیودار کے قریب مدّت تک رہا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ دیوتاؤں نے خصوصیت سے اس درخت کو دوسرے درختوں پر کیوں ترجیح دی ہے۔ ہمالہ کے علاقے میں اُگنے والے تمام درختوں میں دیودار سب سے زیادہ شاندار ہوتا ہے چاہے یہ تنہا ہو یا جنگل میں اس کے ساتھ اور بھی دیودار، صنوبر، چیڑ اور فر کے درخت اُگے ہوئے ہوں مگر اس کی شان ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اس کی اپنی ایک عظمت ہے، سرفرازی ہے اور اپنی قوت ہے۔ کس طرح لاپروائی کے ساتھ وہ اپنے شانوں پر سے برف جھٹکتا ہے، یہ اگر تم نے کبھی دیکھا ہے تو تمھیں اس کی عظمت کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ جس طرح وہ ہوا کو پکڑ کر اپنے پتّوں میں قید کر لیتا ہے اور پھر اُسے سُریلی اور درد بھری آواز میں گانے پر مجبور کرتا ہے یہ تم سنو تب ہی تمھاری سمجھ میں آسکے گا کہ

اس نے دیوتاؤں کو کیوں اور کس طرح اپنی طرف متوجہ کیا ہوگا۔

دیودار چیڑ کی طرح خوشبو تو نہیں بکھیرتا لیکن اُس میں ہوا گھُس کر جو موسیقی پیدا کرتی ہے وہ بڑی سُریلی ہوتی ہے۔ اگر یہ درخت چل پھر سکتے تو اونچا لمبا، سیدھا اور کڑا دیودار چلتا ہوا بے حد باوقار معلوم ہوتا۔ ذرا اس منظر کا تصور تو کرو کہ دیودار کی پوری فوج کی فوج پہاڑ کی ڈھلانوں پر مارچ کر رہی ہے۔ یہ تم صرف تصور ہی کر سکتے ہو کیوں کہ حقیقت میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے!

دیودار، عمارتی لکڑی کے تین اہم ترین درختوں میں سے ایک ہے۔ دوسرے دو ہیں ساگون اور سال۔ دیودار کی لکڑی عمارت سازی میں بہت زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔ تم نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ ریل کی پٹریاں لکڑی کے کندوں پر رکھی ہوتی ہیں انھیں "سلیپر" کہتے ہیں۔ یہ سلیپر دیودار کے ہی ہوتے ہیں۔ چیڑ کی لکڑی دیودار کی طرح مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتی لیکن اس درخت سے رال کافی نکلتی ہے جس سے تارپین اور لاکھ بنائی جاتی ہے۔ چلغوزے تو تم نے
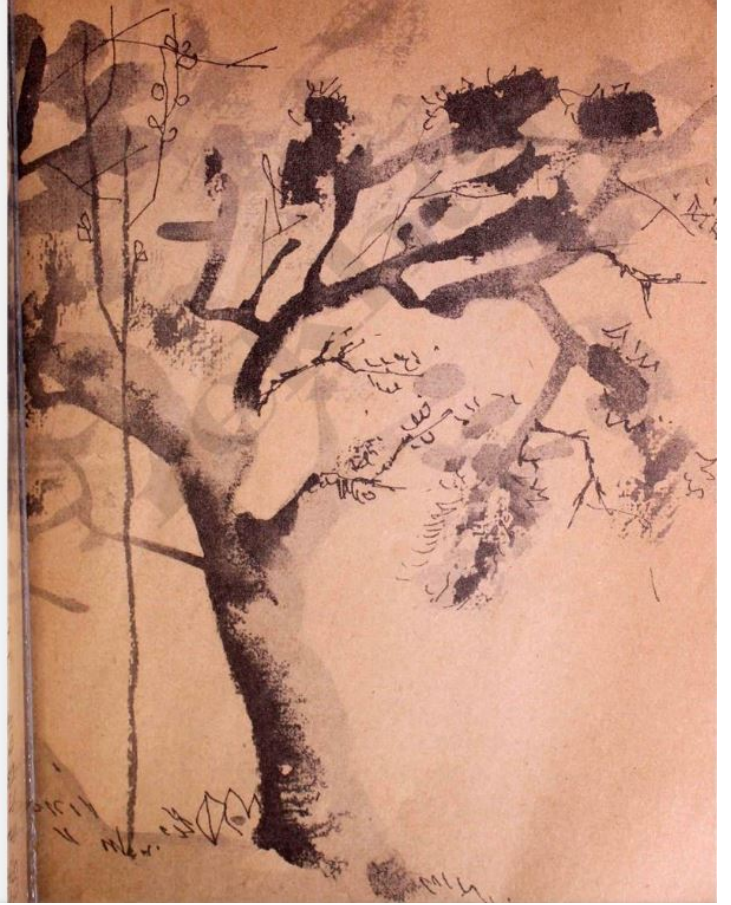
ضرور کھائے ہوں گے۔ ہندوستان میں ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن بڑے ہی مہنگے ہوتے ہیں۔ یہ خشک میوہ اسی چیڑ کا پھل ہے۔

چیڑ اور دیودار کے برعکس شاہ بلوط کا درخت قدرے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی ٹہنیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور جب لوگ اس کی ٹہنیاں ایندھن کے طور پر کاٹ کرلے جاتے ہیں تو شاہ بلوط اور بھی بے ڈھنگا نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود شاہ بلوط پرندوں اور کیڑوں کے حق میں بڑا ہی مہمان نواز ثابت ہوتا ہے۔ سلوٹ در سلوٹ اور جھریوں والے تنے کی چھال میں اپنی غذا تلاش کرتے ہوئے "کھٹ کھٹ" بڑھئی کی "کھٹ کھٹ" پہاڑی علاقے کے لوگوں کے لیے ایک مانوس آواز ہے۔ اکثر دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاہ بلوط ویران پڑا ہوا ہے لیکن پھر یکایک "زوں" کی سی آواز آتی ہے جیسے بجلی کوند رہی ہو۔ تم گھبرا کر اوپر دیکھتے ہو اور ــــ لمبی دموں اور نیلے پروں والے گل دم پرندوں کا جھنڈ شاہ بلوط کے جنگل پر سے گزرتا ہوا نظر آجاتا ہے۔

ہار گیا تھا۔ اور اب وہ شاہ بلوط کی بلند ترین چوٹی پر بیٹھ کر دُہائی دیتا ہے کہ "انیائے۔ انیائے"۔
یعنی ناانصافی۔ ناانصافی!
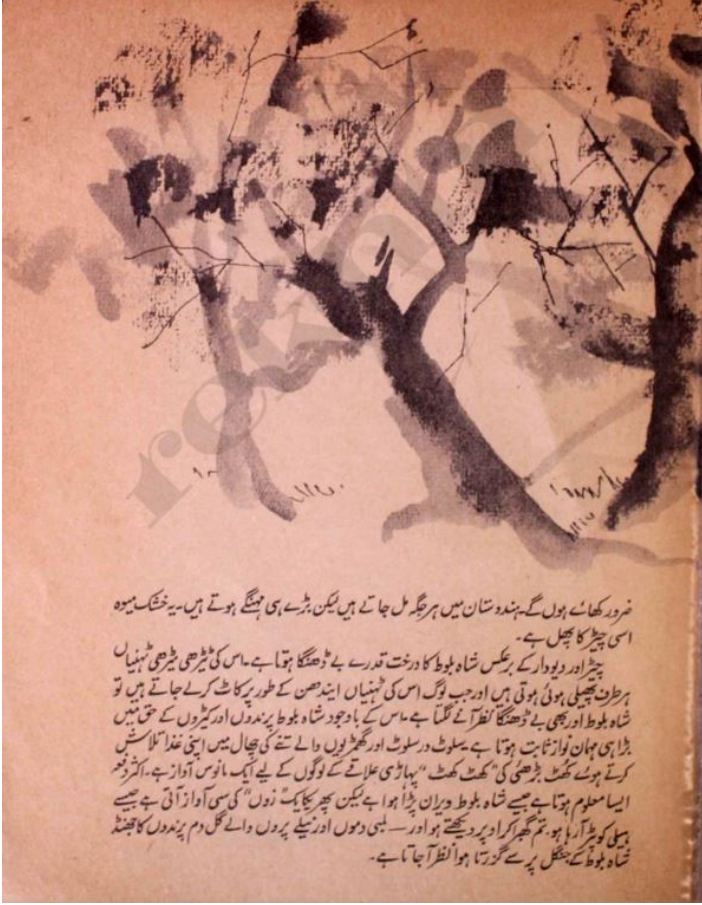
سالَ کے ہر موسم میں شاہ بلوط
میں پرندے رہتے ہیں۔ فروری میں
ہرے ہرے پروں والے توتے، سفید
رخساروں والے بلبل اور کبھی کبھی
دودھ راج جنھیں شاہ بلبل بھی کہا
جاتا ہے — اور سال کے ہر موسم میں
پرندوں کی بازوؤں کی سنسناہٹ
سُنائی دیتی رہتی ہے لیکن وہ کبھی
کبھار ہی دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ
ان کی رسیلی آوازیں اکثر سُنائی دیتی
رہتی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے کوئی سازندہ آخر میں ایک سُر

بھول گیا ہو اور پھر وہ پرندہ بھی ہوتا ہے جسے باربٹ
کہتے ہیں۔ یہ آکر بلند ترین شاہ بلوط کی بلند ترین چوٹی
پر بیٹھتا ہے اور لامتناہی نغمہ چھیڑ دیتا ہے۔ پہاڑی
لوگ اس پرندے کے متعلق ایک کہانی سُنایا کرتے ہیں:
باربٹ ساہوکار کا دوسرا جنم ہے جو ایک مقدمہ

برسات کے موسم میں شاہ بلوط اور بانسوں پر کائی جم کر لٹکنے لگتی ہے لیکن مارچ کے مہینے میں سارے ہی لال پھول ایسے کھل جاتے ہیں جیسے آگ لگ گئی ہو۔ یورپ میں رھوڈوڈنڈرن حالانکہ ایک جھاڑی ہوتی ہے لیکن ہمالہ کی ترائی میں یہ ایک کافی بڑا درخت ہوتا ہے۔ بہار کے موسم میں جنگل میں پھول پتیوں کا فرش سا بچھ جاتا ہے۔ پہاڑی لوگ ان پھولوں سے بے حد لذیذ چٹنی بناتے ہیں۔ پھولوں کی پیالیاں ایک قسم کے رس سے بھری ہوتی ہیں اور کبھی کبھی باتونی بلبلیں اتنا زیادہ رس پی جاتی ہیں کہ انھیں نشہ سا ہو جاتا ہے۔

سیب، ناشپاتی، خوبانی، آڑو، چیری اور اخروٹ وغیرہ ان پہاڑوں اور وادیوں میں کثرت سے ہوتے ہیں۔ اخروٹ کا درخت پتے پتیاں جھڑ جانے پر دیودار کی طرح خاصا خوبصورت لگتا ہے۔ دراصل یہ درخت ہی ہمالہ کی وادی کا اصل باشندہ ہے۔ رہا سیب تو یہ کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے انگلستان سے لایا گیا تھا۔ یہ نوآباد درخت یہاں لگ گیا اور اب بہت سے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے ملتا ہے۔

مارچ کے آخر تک سیب کے درخت سوئے رہتے ہیں اور پھر قدرت کا ایک معجزہ رونما ہوتا ہے اور ایک صبح تم بیدار ہو کر دیکھتے ہو کہ پہاڑوں کے پس منظر میں سیب کے درخت سفید سفید پھولوں سے لدے کھڑے ہیں اور فضا شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے بھری ہوتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جون کے آخر تک یہ درخت سرخ سرخ سیبوں سے لد جاتے ہیں۔ اور اوپر، دس ہزار فٹ کی بلندی پر، جو درخت ملتا ہے وہ سرو ہے۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آب و ہوا کی وجہ سے سرو غریب کو پالا مار جاتا ہے جس سے سکڑ کر یہ بونا بن جاتا ہے۔ اب یہاں صنوبری قسم کی وہ جھاڑی ملتی ہے جسے جونیپر کہتے ہیں اور ایک اور سخت جان درخت ہوتا ہے "برچ"۔ آگے بڑھنے کے بعد یہ بھی غائب ہو جاتے ہیں اور چٹانوں کے درمیان سے اکا دکا خودرو پھولوں کی جھاڑیاں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اب ہم درختوں کی دنیا کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے برف کی دنیا شروع ہوتی ہے جہاں کچھ نہیں اُگتا اور دراصل یہاں کسی درخت کے اُگنے کی ضرورت

اس سلسلے کی دوسری کتابیں

کتاب	مصنف / مصور	مترجم / مصور	قیمت
باپو (حصہ اوّل، دوم)	مصنف: ایف۔سی۔ فریٹاس	مترجم: صالحہ عابد حسین	3/-
کشمیر	〃 : مالا سنگھ تصاویر: پریانند	〃 : خدیجہ عظیم	1/50
پرندوں کی دنیا	〃 : جہاں آرا	〃 : محمد شفیع الدین نیر	1/50
ہماری ندیوں کی کہانی (اوّل)	〃 : لیلا مجمدار	〃 : رضیہ سجاد ظہیر	1/50
جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	〃 : لیلاوتی بھاگوت	〃 : 〃 〃	1/50
ہمالہ کی چوٹیوں پر	〃 : بریگیڈیر گیان سنگھ	〃 : محمد ذاکر	1/50
رسیلی کہانیاں	〃 : منوج داس	〃 : صغرا مہدی	1/50
آزادی کی کہانی (اوّل)	مصنف: وشنو پربھاکر (دوم) منگل پرکاش	〃 : انور کمال حسینی	3/-
ہماری رلیں	〃 : جگجیت سنگھ	〃 : عرش ملسیانی	1/50
ہندوستان میں غیر ملکی سیاح	〃 : کے۔سی۔ کھنہ	تصاویر: کرشن کھنہ	1/50
آؤ ناٹک کھیلیں	〃 : اوما نند	مترجم: رفیعہ منظور الامین	1/50
بہت دن ہوئے (اوّل)	〃 : ایم۔ چوکسی وپی۔ ایم۔ جوشی	〃 : رضیہ سجاد ظہیر	1/50
〃 (دوم)	〃 : 〃 〃	〃 : پریتم لال	1/50
بہادروں کی کہانیاں	〃 : راجندر اوستھی	〃 : انور کمال حسینی	1/50
روہنت و نندیا	〃 : کرشن چیتنیہ	〃 : 〃 〃	1/50
سدا بہار کہانیاں	〃 : شانتا رنگاچاری	〃 : 〃 〃	1/50
ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (اوّل، دوم)	〃 : میر نجابت علی	〃 : سید احسان	3/-
بڑا پانی	〃 : لیلا مجمدار	〃 : صالحہ عابد حسین	1/50
مورا	〃 : ملک راج آنند	〃 : انور کمال حسینی	1/50
ہاکی کا کھیل	〃 : سردیندو سانیال	〃 : پریتم لال	1/50
خالہ بی کا خاندان	〃 : منوہر داس چترویدی	〃 : محمد شفیع الدین نیر	1/50
پھول اور شہد کی مکھی	〃 : اشوک داور	〃 : انور کمال حسینی	1/50
سب کا ساتھی سب کا دوست	〃 : اوما شنکر	〃 : 〃 〃	1/50
سونا کی سیر	〃 : تارا تیواڑی	〃 : 〃 〃	1/50
روپا	〃 : نکی پٹیل	〃 : ایس۔ اے۔ رحمٰن	1/50

(مندرجہ بالا کتابیں ہندوستان کی سب زبانوں میں ملتی ہیں)

بھی نہیں کیوں کہ اسے ہم دنیا کی چھت کہہ سکتے ہیں اور جو دیوتاؤں کا مسکن ہے!

اس سلسلے کی دوسری کتابیں

کتاب	مصنف	مترجم	قیمت
باپو (حصہ اول، دوم)	مصنف: ایف۔سی۔فریٹاس	مترجم: صالحہ عابد حسین	3/-
کشمیر	〃 : مالا سنگھ تصاویر: پریمانند	〃 : خدیجہ عظیم	1/50
پرندوں کی دنیا	〃 : جمال آرا	〃 : محمد شفیع الدین نیّر	1/50
ہماری ندیوں کی کہانی (اول)	〃 : لیلا مجمدار	〃 : رضیہ سجاد ظہیر	1/50
جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	〃 : لیلاوتی بھاگوت	〃 : 〃 〃	1/50
ہمالہ کی چوٹیوں پر	〃 : بریگیڈیر گیان سنگھ	〃 : محمد ذاکر	1/50
رسیلی کہانیاں	〃 : منوج داس	〃 : صغرا مہدی	1/50
آزادی کی کہانی (اول) مصنف، وشنو پربھاکر (دوم) منگل پرکاش		〃 : انور کمال حسینی	3/-
ہماری ریلیں	〃 : جگجیت سنگھ	〃 : عرش ملسیانی	1/50
ہندوستان میں غیر ملکی سیاح	〃 : کے۔سی۔کھنہ	تصاویر: کرشن کھنہ	1/50
آؤ ناٹک کھیلیں	〃 : اوما نند	مترجم: رفیعہ منظور الامین	1/50
بہت دن ہوئے (اول)	〃 : ایم۔چوکسی و پی۔ایم۔جوشی	〃 : رضیہ سجاد ظہیر	1/50
〃 (دوم)	〃 : 〃 〃	〃 : پریتم لال	1/50
بہادروں کی کہانیاں	〃 : راجندر اوستھی	〃 : انور کمال حسینی	1/50
روہنت و نندیا	〃 : کرشن چیتنیہ	〃 : 〃 〃	1/50
سدا بہار کہانیاں	〃 : شانتا رنگاچاری	〃 : 〃 〃	1/50
ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (اول، دوم)	〃 : میر نجابت علی	〃 : سید احسان	3/-
بڑا پانی	〃 : لیلا مجمدار	〃 : صالحہ عابد حسین	1/50
مورا	〃 : ملک راج آنند	〃 : انور کمال حسینی	1/50
ہاکی کا کھیل	〃 : سردیندو سانیال	〃 : پریتم لال	1/50
خالہ بلی کا خاندان	〃 : منوہر داس چترویدی	〃 : محمد شفیع الدین نیّر	1/50
پھول اور شہد کی مکھی	〃 : اشوک داور	〃 : انور کمال حسینی	1/50
سب کا ساتھی سب کا دوست	〃 : اوما شنکر	〃 : 〃 〃	1/50
سونا کی سیر	〃 : تارا تیواڑی	〃 : 〃 〃	1/50
روپا	〃 : نکی پٹیل	〃 : ایس۔اے۔رحمٰن	1/50

(مندرجہ بالا کتابیں ہندوستان کی سب زبانوں میں ملتی ہیں)